© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

دیوبند، علی گڑھ، ندوہ اور جامعہ ہندوستان میں مسلمانوں کے یہی چار مرکزی ادارے ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی تہذیبی اور تعلیمی تربیت اس طرح کی کہ گویا ان کی نشاۃ ثانیہ ہو گئی۔ انھوں نے زندگی کے مختلف میدانوں میں ترقی کی۔ مذہب اور اس کے علوم و فنون کی حفاظت کے ساتھ علومِ جدیدہ سیکھے، سیاست میں حصہ لیا۔ قومی تعلیم کا اہتمام کیا۔ صاحبِ تصنیف و تالیف علما پیدا کئے، غرضکہ فکر و خیال، اعتقاد و عمل اور جد و جہد حیات کے جو نقوش مسلمانوں کی قومی زندگی میں ابھرے وہ سب مجموعی طور پر انھیں چار درسگاہوں کی کوششوں کے ثمرات تھے۔ یہ درسگاہیں درحقیقت صرف تعلیم گاہیں نہ تھیں بلکہ چار مختلف تحریکیں تھیں۔ جنھوں نے اپنے اپنے دائرۂ عمل و نفوذ میں کام کیا اور بقدرِ حوصلہ و ظرف کامیابی حاصل کی۔ لیکن ہر تحریک کا قاعدہ ہے کہ وہ خاص حالات میں ان کا مقابلہ یا اصلاح کرنے کے لئے پیدا ہوتی ہے اور اس بنا پر اس کی افادیت صرف اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ وہ حالات موجود ہوں۔ حالات کے بدلنے کے ساتھ ضروری ہے کہ اس تحریک کے رخ اور اس کے اپنے آب و رنگ میں تبدیلی پیدا کی جائے ورنہ وہ نغمۂ بے ہنگام بن کر رہ جاتی اور اپنی افادیت کھو دیتی ہے۔

علی گڑھ سے تو راقم الحروف کا تعلق ملازمت کا ہے ہی۔ دیوبند بھی وہاں کی مختلف کمیٹیوں اور اداروں کا ممبر ہونے کی وجہ سے آنے جانے اور دار العلوم کے حالات کو قریب سے دیکھنے اور طلبا کو خطاب کرنے کا موقع ملتا ہی رہتا ہے۔ حسنِ اتفاق سے گذشتہ ماہ دسمبر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ندوۃ العلماء میں جانے اور دونوں اداروں کے اساتذۂ کرام اور طلبا کو خطاب کرنے کا بھی موقع ملا تو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مسلمانوں کے ان چاروں مرکزی اداروں میں حالاتِ جدیدہ کا مکمل شعور و احساس پایا جاتا ہے۔ گویا ان تحریکوں نے اب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک نیا قالب اختیار کرلیا ہے اور جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے اندر جو تبدیلی پیدا کرنی چاہیے تھی اُس کی طرف ان کا قدم اٹھ گیا ہے۔ ایک جمہوری ملک کی اقلیت کے لئے سب سے مقدم اور ضروری یہ ہے کہ وہ موجود حالات کی ناسازگاری سے جو عموماً بعض داخلی اور خارجی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں اُن سے بددل اور مایوس نہ ہو۔ اور اپنے لئے ایک نصب العین متعین کرکے خود اعتمادی اور عزم وہمت کے ساتھ گامزن رہے تاکہ اپنے ملی وجود کی حفاظت وبقا کے ساتھ وہ جمہوری نظام مملکت کے نقشہ میں اپنے لئے عزت و وقار کی جگہ حاصل کرسکے۔ ان اداروں میں جاکر پہلا احساس تو یہ ہوتا ہے کہ یہاں بددلی اور مایوسی کا کہیں نام ونشان نہیں ہے ان کو اپنے مستقبل پر بھروسہ ہے۔ ان کے عزائم میں گرمی اور جوش ہے اور ان کے حوصلوں میں بلندی اور پامردی ہے تقسیم سے پہلے تعلیم قدیم اور تعلیم جدید میں جو تفرقہ تھا اس سے جو نقصانات پہنچے۔ ان کا بھی ہر جگہ احساس ہے اور اس کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ اب یہ چاروں ادارے ایک دوسرے سے زیادہ قریب آگئے ہیں اور ان میں وہ بعد وافتراق باقی نہیں رہا جو پہلے پایا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک طرف ان اداروں کے عمائد اور ذمہ دار حضرات کی آمد ورفت ایک دوسرے کے ہاں رہنے لگی ہے۔ اور دوسری جانب دیوبند اور ندوہ کے فارغ التحصیل طلبا جو علی گڈھ اور جامعہ میں داخل ہوکر انگریزی اور علومِ جدیدہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پھر ہمارے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جو دینی اور اسلامی شعور ترقی کر رہا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ علی گڈھ میں اب آپ کو ایسے طلبا کافی تعداد میں نظر آئیں گے جن کی وضع قطع اور شکل وصورت کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ دیوبند یا ندوہ کے طالب علم ہیں۔ پرانے لوگوں کا بیان ہے کہ جمعہ کی نمازمیں خاص طور پر اور دوسری نمازوں میں عموماً طلبا کا جو ہجوم اب ہوتا ہے۔ پہلے نہیں ہوتا تھا۔ علی گڈھ اور جامعہ دونوں جگہ اسلامیات اور دینیات کی تعلیم کا انتظام پہلے بھی تھا لیکن دوسرے شعبوں کے ساتھ ان شعبوں میں بھی اب غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اور طلباء وطالبات کی ان مضامین کے ساتھ دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ اسلامی مباحث ومسائل پر مذاکرہ وگفتگو کے لئے اجتماعات بھی نسبتاً زیادہ ہونے لگے ہیں۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب اور مولانا سید ابوالحسن علی الندوی دونوں حضرات اکابر علما میں سے ہیں۔ اور ساتھ ہی بڑے بیدار مغز اور روشن دماغ بھی ہیں اور دونوں ہی بیرون ہند ممالک کا دورہ اور سیاحت کرچکے ہیں۔ اس لئے جس طرح ان کو اپنے ملک کے جدید تقاضوں اور مطالبوں کا شعور وادراک ہے وہ اس سے بھی باخبر ہیں کہ بین الاقوامی حالات

© rasailojaraid.com